ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

مرصّع ورنگین اُردو نثر کے دو نمائندے
(تحسینؔ اور سرورؔ)

Two representatives of Euphuistic and Flowery Urdu Prose
(Tahseen & Saroor)

ڈاکٹر تنویر غلام حسین
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
منہاج یونیورسٹی، لاہور

Abstract:

The works of Tahseen and Saroor, two personalities of Urdu language literature, which carry the tradition of Persian and Arabic language together, "Notarz-e-Mursa" and Fasana-e-Ajab" are two representative stories of Euphuistic and Flowery Urdu prose. These two stories are milestones in the evolution of Urdu language. In the evolution of Urdu, these stories are recognized as the representative narratives of old prose.

By studying these stories, the reader can see the difference between the classical style of writing and today's style. The main purpose of writing this article is that today's reader should be aware of the capital of his ancient Euphuistic and Flowey literary Urdu prose.

Keywords:

Representatives, Urdu Prose, Notarz-e-Mursa, Fasan-e-Ajaeyb, Style, Complicated, civilization, composition, masterpiece, attraction.

قدیم اُردو نثر کے اسالیبِ نگارش کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اُسلوب کی وہ روایت ملتی ہے جو فارسی انشاء پردازی کے قدم بہ قدم چلی اور ایک عرصے تک ایک خاص ذوق کے پڑھنے والوں کو مسحور کرتی رہی۔ اُردو نثر میں اس روایت کی دو نمائندہ تالیفات تحسین کی نوطرزِ مرصّع اور سرور کی فسانۂ عجائب قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے اور آخر الذکر اس کے بعد لکھی گئی۔ اردو میں شاعرانہ یعنی مرصّع ورنگین اور مقفیٰ و مسجع نثر میں اولیت "نوطرزِ مرصّع" کو حاصل ہے جب کہ نقطۂ عروج "فسانۂ عجائب" کو تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے مقالے میں ان تالیفات کے اسلوبِ نگارش کا تذکرہ الگ الگ کرنا مناسب ہوگا۔

نوطرزِ مرصّع از تحسینؔ

شمالی ہند میں اردو نثر کی مرصع داستان "نوطرزِ مرصّع" کے مولف میر محمد حسین عطا خان المتخلص بہ تحسین ولد میر محمد باقر خاں، اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ رائج الوقت تعلیم بخوبی حاصل کی تھی جس کی بہ دولت کمپنی کی حکومت میں اچھے مناصب پر فائز رہے۔ خوش نویس بھی تھے اور اس بنا پر "مرصّع رقم" خطاب تھا۔ انھوں نے اپنے خود نوشتہ مرصّع دیباچے میں اس داستان کی تالیف کا سبب یہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ جنرل سمتھ کے ہمراہ کشتی پر سوار کلکتے جا رہے تھے۔ طویل سفر میں دل بہلانے کی خاطر داستان سرائی کا سلسلہ شروع ہوا اور اس ضمن میں اُن کے ایک ساتھی نے چہار درویش کی داستان سنائی۔ یہ داستان سُن کر اُن کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اسے مرصّع ہندی میں لکھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے یہ کام شروع کر دیا جو وقفوں سے جاری رہا۔ عظیم آباد کی ملازمت (وکیل نظامت) سے الگ ہونے کے بعد وہ کچھ عرصہ بیکار رہے۔ پھر نواب شجاع الدولہ والیِ اودھ کے دربار سے وابستہ ہو کر اس داستان کے چند مقامات اُنھیں سنائے۔ نواب نے اسے پسند کیا اور مکمل کرنے کی ہدایت کی تحسین نے اس کی تکمیل کی لیکن ابھی وہ پیش کرنے نہ پائے تھے کہ نواب شجاع الدولہ کا انتقال (1188ھ/1875ء میں) ہو گیا۔ دو ایک سال کے بعد کچھ عبارتیں اور قصائد وغیرہ کا اضافہ کر کے شجاع الدولہ کے جانشین نواب آصف الدولہ کی خدمت میں پیش کی۔ اس اعتبار سے نوطرزِ مرصّع تقریباً ۱۷۶۸ء میں شروع ہو کر ۱۷۷۵ء میں تکمیل کو پہنچی۔(1)

نوطرزِ مرصّع میں قصہ چہار درویش بیان کیا گیا ہے جسے بقول پروفیسر محمود شیرانی محمد شاہی عہد میں لکھا گیا۔ قدیم مولفین میں حکیم محمد علی اور انجب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان مولفین کا انداز نسبتاً سادا اور زبان صاف تھی۔ بعد کے مولفین نے عبارت کو بہت رنگین اور شگفتہ بنا دیا۔ ان مولفین میں سے میر احمد خلف شاہ محمد کی تالیف زیادہ تر چھپی اور مشہور ہوئی۔ قصہ چہار درویش کو امیر خسروؒ سے منسوب کرنے والے بھی یہیں مولف تھے۔ تحسینؔ کا ماخذ یہ نسخہ نہیں تھا، البتہ میر امن کا ماخذ تحسین کی تالیف نوطرزِ مرصّع کے علاوہ فارسی کا یہ نسخہ بھی تھا۔ نوطرزِ مرصّع کے افسانوی پہلوؤں کا تجزیہ ہمارے مطالعے کی حدود سے باہر ہے۔ اس لیے مقالے میں ہم اپنے جائزے کو اُسلوب نگارش کی بحث تک محدود رکھیں گے۔ تحسینؔ نے اس قصے کو مرصّع ورنگین پیرائے میں لکھ کر اس کی ضرورت وافادیت اور ادب میں اپنا مقام پیدا کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

"طاؤس نگارین خیال کا پیچ دماغ خاطر کے یوں جلوہ گر ہوا کہ اگرچہ پیشتر دو تین نسخے از قسم انشائے تحسین وضوابط انگریزی وتواریخ قاسمی وغیرہ کے بقدر حوصلہ اپنے پیچ عبارت فارسی کے تصنیف کیے ہیں لیکن مضمون اس داستان بہارستان کے تئیں بھی پیچ عبارت رنگین زبانِ ہندی کے لکھا چاہیے کیونکہ آگے سلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہیں ہوا، اور یہ کہ جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبان اردوے معلیٰ کا رکھتا ہو، مطالعہ اس گلدستہ بہاریں کے سے ہوش وشعور فحوائے کلام کا حاصل کرے کہ واسطے علم مجلس کے لسانی زبان ہندوستان کی پیچ حق آدمی بیرونجات کے خراد کندۂ ناتراش کے تئیں ہے۔"(2)

یعنی اس تالیف کو رنگین عبارت میں لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جو غیر ملکی ہندوستان میں آکر علم مجلس سیکھنا چاہیے اُس کے لیے زبانِ اردوے معلی کا یہ انداز خراط کا کام دے۔ علمِ مجلس اُس زمانے میں امرا کے درباروں تک رسائی کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ درباروں کی شان وشوکت اور تکلف و تجمل کا اظہار رنگین اور مرصع زبان میں ہوتا تھا جس کی روایت فارسی نثر میں صدیوں پہلے پختہ ہو چکی تھی۔ دورِ انحطاط میں یہی روایت فارسی سے اب اُردو میں منتقل ہو رہی تھی۔ اس روایت کا خاصہ یہ تھا کہ بات سے زیادہ بات کہنے کے انداز پر توجہ دی جاتی تھی۔ ذرا سی بات کو عبارت آرائی سے بے جا طول دے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا جاتا تھا اور حقیقتِ حال کے اظہار سے زیادہ قوتِ متخیلہ کی بے محابا پرواز پر تکیہ کیا جاتا تھا۔ تحریر میں فطری جذبے کی موجودگی ضروری نہ تھی، البتہ جذبات کے خارجی مظاہر کا میکانکی بیان کافی سمجھا جاتا تھا۔ دور از کار تشبیہات اور پیچ در پیچ استعارات سے عبارتوں کو سجھایا جاتا تھا۔ بلند آہنگ تراکیب اور اضافتوں کی کثرت سے فقروں کو طویل، پیچدار اور بارعب بنایا جاتا تھا۔ محاسن و معائب کے بیان میں حد درجہ مبالغہ کو ضروری سمجھا جاتا اور مناظر کشی میں موقع کی حقیقی جزئیات پیش کرنے کے بجائے ترصیع کا انداز اختیار کیا جاتا تھا۔ صنائع لفظی و معنوی کے جا و بے جا استعمال اور قافیے اور سجع کے التزام پر لکھنے والے کی خصوصی توجہ رہتی تھی۔ یہ امور فارسی کے مصنوعی اور پُر تکلف اسلوب کے نمایاں اوصاف اور انشاپردازی کے لوازم سمجھے جاتے تھے۔ تحسین اسی روایت کے پروردہ اور دلدادہ تھے۔ پھر دربارِ اودھ سے وابستگی نے اس رجحان کو قوی تر کر دیا۔ کیونکہ اس نئی نئی امارت میں دولت کی ریل پیل کے ساتھ شوکت و تجمّل اور کرّوفر نے تکلف و تصنع کی حد تک فن کے حیران کن طور طریقوں کو اپنے اوپر مُسلط کر لیا تھا۔ لکھنوی تہذیب جو اندر سے کھوکھلی اور بظاہر چمکدار تھی، یہاں کے شعر وادب پر چھائی ہوئی تھی۔ تحسین کی نوطرزِ مرصّع بھی اسی تہذیب کی نمائندہ تھی۔ مرصّع و رنگین فارسی اُسلوب کا مرعوب کن انداز مغلوں کے عروج واقبال کے زمانے میں شوکت و تجمل کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ یعنی اس کی قوت کا سرچشمہ وہ پُر شکوہ دربار تھے جو سیاسی استحکام کی مضبوط بنیادوں پر قائم تھے۔ نوابانِ اودھ کے دربار سیاسی اعتبار سے کھوکھلے تھے۔ اس کھوکھلے پن کا بھرم قائم رکھنے کے لیے صرف دولت کی ریل پیل سے مصنوعی چمک دمک اور شان وشوکت ہی پیدا ہو سکتی تھی۔ اس لیے تکلف و تصنع کا احساس اس تہذیب کی ہر نوع میں جھلکتا ہے۔ نوطرزِ مرصّع کے اسلوب کو بھی اس تہذیبی رویے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ نوطرزِ مرصّع کے اُسلوب کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"نوطرز مرصع جس وقت لکھی گئی اس وقت تک اردو نثر کو علمی درجہ نصیب نہ تھا۔ نوطرزِ مرصّع کے پون صدی بعد تک اردو کے شعرا اردو نثر کو سرمایہ ننگ سمجھتے تھے۔ مثنویوں کی فصلوں کے عنوان فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ فارسی کے متاخرین انشاپردازوں کی تصانیف مثلاً بیچ رقعہ، مینا بازار، سہ نظر ظہوری وغیرہ کا بول بالا تھا۔ اردو میں نثر لکھی جائے تو ان کی تقلید کے سوا چارہ نہ تھا۔ نوطرزِ مرصع کا اسلوب زیادہ سے زیادہ متعلق، مصنوعی اور پُر تکلف ہے۔ اگر ایک طرف اس کتاب میں تشبیہ واستعارہ کی افراط، مبالغے کی بلند پروازی، تخیل کی فلک سیری ہے تو ساتھ ہی ساتھ عربی وفارسی کے موٹے لغات، فارسی کے انداز پر جار ومجرور اور صفت وموصوف کی معکوس ترکیب، توازن وہمواری کا فقدان اور تعقید وگنجلک ہے۔ "(3)

"نوطرزِ مرصّع" میں تحسین نے فارسی کے اس مصنوع اور پُر تکلف اسلوب کی پیروی زبانِ اردوے معلی میں کر کے اُردو میں انشاپردازی کے ایک نئے رجحان کا آغاز کیا۔ وہ اپنے آپ کو اس ایجادِ تازہ کا موجد کہتے ہیں اور اس یہ بیان اس لحاظ سے درست ہے کہ کربل کتھا سمیت جو دوسری تحریریں اس وقت تک اُردو میں لکھی گئی تھیں اُن میں فارسی انشاء کی رنگینی اور مرصّع کاری کو اُردو نثر میں سمونے کا یہ فن کارانہ شعور کارفرما نہ تھا۔ تحسین اس اعتبار سے صحیح معنوں میں مرصّع رقم تھے اور اگرچہ یہ خطاب اُنھیں خطاطی کی وجہ سے حاصل ہوا تھا لیکن مرصّع انشاپردازی نے اُن کے اس خطاب میں دوگونہ معنویت پیدا کر دی تھی۔

نوطرزِ مرصّع کا دیباچہ از سرتاپا رنگینی، تکلف اور صنعت گری سے مرصّع کیا گیا ہے۔ نواب شجاع الدولہ کی تعریف میں توصیفی الفاظ کی بھرمار اُسی درباری روایت کا ایک حصہ ہے جس کے تتبع میں یہ داستان رقم کی جا رہی تھی۔ داستان (یادرویشوں کے مختلف قصوں) کے بیان میں بھی زیادہ تر عبارت آرائی کی بھرپور کوشش ملتی ہے جس میں ذہنی مشقت سے خاصا کام لیا گیا ہے۔ داستان کے ہر ہر ورق کو مزین کرنے اور رنگین تلازمات سے مرصّع بنانے میں مصنف نے بڑی عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

۔ جگہ جگہ تشبیہوں، استعاروں اور صنائع بدائع کا التزام کر کے ان شعری عناصر سے عبادت کو سجانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فارسی ترکیبوں اور اضافتوں کے ذریعے فقرے طویل اور پیچدار صورت اختیار کرتے ہوئے پڑھنے والوں کو بیان کی بھول بھلیوں میں پھنساتے نظر آتے ہیں۔ عربی اور فارسی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ سے مصنف قاری پر اپنی علمیت اور زباں دانی کا خوب رعب جماتا ہے۔ نہ صرف یہ بھاری بھر کم الفاظ، بلکہ جملوں اور فقروں کی ترکیب بھی فارسی قواعد وانشا کے تانے بانے پر اٹھائی گئی ہے جس کے درمیان فارسی کے حروفِ ربط کا ترجمہ ہندی کے حروفِ ربط میں کر دیا گیا ہے تاکہ اسے اُردو سمجھا جا سکے۔ یہی حال افعال کی ترتیب کا ہے اور یہی صورت مضاف اور مضاف الیہ کی تقدیم وتاخیر کی ہے۔ عبارتوں کی عبارتیں پڑھتے جایئے، اس میں اُردو پن کا بہت کم احساس ہوتا ہے۔ یہ تضاد اُس وقت زیادہ نظر آنے لگتا ہے جب معاصر شعرا کے سادا اور رواں شعر رنگین نثر کے درمیان آکر اردویت کے فطری مزاج کا احساس دلاتے ہیں۔ یہاں صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولف اردو کے عام مزاج اور روز مرہ سے ہٹ کر کہانی کہنے کے بجائے اُسے زبان وبیان کے دلفریب پھندوں میں اسیر کر کے اپنی انشاپردازی سے پڑھنے والوں کو مرعوب ومسحور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ اس اختراعی کوشش میں اُنھیں خاصی محنت ومشقت کرنی پڑ رہی ہے۔

یہ حقیقت اُس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب عدیم الفرصتی کے سبب وہ اس محنت سے پہلو تہی کرتے ہیں یا جہاں داستان کے واقعات اُسے کچھ رکنے اور سوچنے کی مہلت نہیں دیتے۔ ایسے موقعوں پر دقیق، پیچیدہ اور رنگین عبارتوں کے بجائے کہانی از خود سادا و سلیس بیانیہ انداز اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس داستان کو مصنف بڑے تکلف واہتمام کے ساتھ اُسلوب کا رنگین ومزین جامہ پہنانے کے لیے شروع کرتے ہیں وہ اپنے فطری تقاضوں کے تحت کہیں کہیں صنعت گری کے پُر تکلف دائرے سے باہر ہو کر سادگی وروانی کی عام پسند شاہراہ پر نکل آتی ہے۔ کیونکہ داستان بنیادی طور پر بیانیہ اندازِ نگارش کی مقتضی ہوتی ہے اور واقعہ نگاری میں تکلفات کا التزام اس کے قصے پن کو مجروح کرتا ہے۔ تاہم عبارت آرائی کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے واقعات کے قدرتی بہاؤ میں یہ تکلفات کبھی کبھی ریت کی دیوار کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ نوطرز مرصع میں بھی مولف ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہوئے ہیں۔

نوطرزِ مرصّع میں ہر درویش کی داستان کا آغاز اس طرح کے مرصّع فقروں سے ہوتا ہے۔ اس کا موازنہ عجائب القصص اور باغ وبہار کے اسی موقع کے فقروں سے کر کے دیکھا جائے تو مصنوعی انداز اور فطری طرز کا فرق از خود واضح ہو جائے گا:

"اتنے میں درمیان اُن چہار درویش کے ایک شخص نے عندلیبِ زبان کے تئیں بیچ گلزار سخن آرائی کے نغمہ پرداز کیا کہ اے یارانِ ہمراز وے رفیقانِ دمساز۔۔۔الخ"(4)

"تب درویش دوم نے عندلیب خوش لہجۂ زبان کے تئیں بیچ گلزار بیان کے یوں داستاں سرا اس معنی رنگیں کا کیا۔"(5)

"تب درویش سویم نے طوطی زبان کے تئیں اوپر سر گزشت اپنی کے یوں مترنّم کیا۔۔۔ "(6)

"درویش چہارم نے زار زار مانندِ ابرِ بہار رو کے حقیقت حال خیریت اشتمال اپنی کے تئیں قلم زبان سے اوپر صفحہ بیان کے یوں نگارش کیا ۔۔۔"(7)

صبح وشام کے مناظر کا بیان بھی فطری انداز کے بجائے قوتِ متخیلہ کے زور سے ترصیع کی صورت میں اس طرح ہوا ہے کہ نگاہوں کے سامنے موقع کی تصویر کے بجائے مرصّع الفاظ اور رنگین تلازمات کا سلسلہ پھیل جاتا ہے اور قاری کا ذہن ان کے پیچ وخم میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہاں صرف دو تین مثالیں کافی ہوں گی۔

"جب طائرِ زریں بال آفتاب کے نے رُخ بیچ آشیانۂ مغرب کے کیا! اور بیضۂ سیمیں ماہتاب کا بطن مرغِ مشکیں شب تار کے سے نمودار ہوا۔۔۔ (8)"

"روز چہارم جب کیخسرو سیمیں بخت ماہ کا بیچ شبستان مغرب کے گیا اور شہسوار زریں لباس آفتاب کے نے بیچ میدان افق کے قصد ترک تازی کا کیا۔۔۔"(9)

"روز چہارم جس وقت مغبچہ مخمور خورشید کا خمخانہ مشرق کے سے گلابی صبح کی ہاتھ میں لے کر واسطے شکست خمار کے طرف ساغر گل کے کہ شراب صبوحی شبنم کی سے پُر تھا متوجہ ہوا۔۔۔"(10)

اسلوبِ نگارش کے تناظر میں اگر نوطرزِ مرصع اور باغ وبہار کا موازنہ کیا جائے تو انھی مواقع پر میر امن نے باغ وبہار میں صرف درج ذیل فقرے لکھے ہیں:

"غرض جب شہر کے دروازے پر گیا، بہت رات جا چکی تھی۔ " (11)

"جب صبح ہوئی، اُس جوان نے جگایا"(12)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

"جب صبح ہوئی اور آفتاب دو نیزے بلند ہوا، تب میری آنکھ کھلی۔"(13)

ان سادہ فقروں میں منظر کشی نہیں کی گئی لیکن صبح ہونے یا رات پڑنے کی اطلاع ضرور ہو جاتی ہے اور قاری کا ذہن کسی پیچیدگی میں اسیر نہیں ہوتا۔

نوطرزِ مرصّع میں یہی حال واقعات کے بیان، کرداروں کی گفتگو اور عمل کا ہے۔ عبارت آرائی کی خاطر ترکیبوں، اضافتوں تشبیہوں، استعاروں، محاوروں، لفظی رعایتوں، صنائع بدائع اور عربی فارسی کے دقیق، نامانوس الفاظ اور موقع ملنے پر قافیے اور سجع کے التزام پر مؤلف کی کتنی نظر رہتی ہے؟ اس کی وضاحت کے لیے ذیل میں چند عبارتیں درج کی جاتی ہیں:

"بادشاہ نے جو وزیر کے تئیں شریک رنج راحت اپنے کا جانا مطابق مضمون اِس شعر کے:

حالِ دل کچھ کہا نہیں جاتا آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

لاچار تمام باعث کلفت طبع مقدس کا مفصل ارشاد کیا اور فرمایا کہ اے رمز شناس عالمِ مزاج دانی کے جو منشی تقدیر کے نے بیچ سرنوشت میری کے تولد فرزند کا نہیں لکھا اور ایام زیست کے قریب الانقضاء ہیں کہ آئندہ توقع استحصال اس نعمت غیر مترقب کی پیشِ نہادِ خاطر کے رکھتا، پس اب واسطے چند روز کے کیا ضرور ہے کہ اوقات اپنی کے تئیں بیچ کار و بار اس دارِ ناپائیدار کے صرف کروں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ ترک تعلق دنیوی اور تبدیل لباس کا کر کے درمیان صحرائے لق ودق کے کہ جہاں بُود و نشان انسان کا نہ ہو بیچ عبادت حضرت واجب الوجود کے مشغول ہوں۔"(14)

"بادشاہ نے جو زرِ التماس وزیر کے تئیں اوپر محک رائے زرّیں کے کسا، معلوم کیا طلاے ناب اُس کے کا بلا تشکیک کامل عیار کا ہے، عارضِ عرض معروضِ خردمند کے تئیں ساتھ گلگونۂ اجابت کے رونق بخشی اور مکان خلوت کے سے اُٹھ کے اوپر تخت سلطنت و فرمانروائی کے جلوس فرمایا اور گلزار خلافت کے کہ بہ سبب بادِ سموم بے انتظامی و ہنگامہ پردازی کے ژولیدہ ہوئے تھے سِرنو سے ساتھ رشحاتِ سحاب انتظام و تسلط کے سرسبز و شاداب ہو کے صدا نقارۂ مبارکی و فرخی کی بیچ گنبدِ دوّار سپہر کے پہنچی اور صفیر نفیر تہنیت اور شادی کی بیچ شش جہت عالم کے بلند ہوئی۔"(15)

"ملکہ نے صرف زبان سے سرخی حکایت سر گزشت اپنی کے تئیں اوپر قرطاس بیان کے اس طور سے دُرریز کیا کہ مَیں دختر والی اس ملک یعنی سواد اعظم سرزمین ولایت دمشق کی ہوں اور وہ بادشاہ ذی جاہ از بس رفعت و ثروت و منزلت سے ظل افتخار کا اوپر فرقِ فرق داں کے رکھتا ہے جو سوائے میرے اور فرزند بیچ مشکوے خلافت کے نہیں، عہد خوردگی سے درمیان مہد ناز و نعمت کے زیر سایۂ عاطفت و پرورش مادر و پدر بزرگوار کے بسر لے جاتی اور ہمیشہ بزم عیش و نشاط کی آراستہ کر کے بیچ اکل و شُرب شراب و کباب کے ساتھ صحبت محرمانِ ہمراز و مصاحبان دمساز کے مشغول رہتی"(16)

مذکورہ بالا عبارتوں میں پیچ وخم کھاتے اور دائرے اور قوسیں بناتے ہوئے طویل فقرے مولف کی انشاپردازی کے شہکار تو ضرور ہیں لیکن داستان کے کرداروں کی زبان معلوم نہیں ہوتے۔ میرامن ایسے موقعوں پر کرداروں کے ماحول اور جذبات کا خیال رکھتے ہوئے فطری زبان استعمال کرتے ہیں۔ تحسین اس قسم کے فطری عناصر سے داستان میں اثر و لطف پیدا کرنے کے بجائے صرف عبارت آرائی سے قارئین کو متاثر کرنے کی مصنوعی کوشش کرتے ہیں۔ ذیل میں نوطرزِ مرصّع سے دو ایسے مواقع کی، عبارتیں درج کی جاتی ہیں۔ ان کا موازنہ انھی مواقع کی باغ و بہار کی عبادتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ فطری اور غیر فطری انداز کا فرق بہ خوبی واضح ہو جائے گا۔ (تقابل کے لیے باغ و بہار کی متعلقہ عبارتیں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں) ۔

"زنِ وزیر نے بہ گریہ وزاری و نوحہ و بے قراری سر کے بال کھسوٹ کے زیور دور کیا اور لباس بدن کا پھاڑا۔ لیکن وزیر ایک دختر عاقلہ اور فرزانہ رکھتا تھا کہ ہمیشہ بیچ عیش و عشرت کے اور راگ ورنگ و شراب و کباب میں مشغول رہتی تھی۔ والدہ اُس کی نے آکر اُس کو سرگرم نائے و نوش کا پایا۔ ایک جھکّڑ دو دستی کہ جس کو دو ہتھڑ کہتے ہیں اوپر سر کے ماری اور کہا کہ اے کمبخت بے وفا وائے بدبخت پُر جفا، اگر آج کے روز ایک کانا کھدرا یا کنونڈا بیٹا ہوتا تو وہ بھی کام آتا اور اپنے باپ کو قید سے چھڑاتا، تجھ کمبخت کو کیا کروں کہ وارث میرا قید ہے اور تو شراب و کباب اور راگ ورنگ کی صید ہے۔(17)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

" تب ملکہ نے مجھ سے فرمایا کہ سُن، اے عزیز میں دختر روشن اختر فرمانروائے زیر آباد کی ہوں۔ ایک روز نظر میری خلف الصدق وزیر اعظم کے اوپر پڑی۔ بہ ہزار جان و دل فریفتہ اور عاشق اُس کی ہوئی اور دایہ محرم اسرار اپنی سے کہا:

مرتی ہوں میرے حال پہ دایہ نظر کرو ٹک جا خدا کے واسطے اُس کو خبر کرو
بیکس کو بس میں کرکے سو تم مارتے ہو کیوں وہ کچھ نہیں خدا کا تو تھوڑا سا ڈر کرو
اے نالہ ہائے شوق اگر تم میں درد ہے اُس بے وفا کے دل میں تو جاکر اثر کرو

مبلغ نمایاں اور زر بسیار کارسازی میں خرچ کیے۔ تاکہ خلوت میں بلا کر مقصد حاصل کیا۔ چنانچہ ہر شب اتفاق ملاقات کا ہوتا تھا۔ ایک رات اُس کو پاسبانوں نے التباس شب رَو میں پکڑا اور بادشاہ کے حضور میں لے گئے۔ بہ سبب اس کے کہ شب میں پہچانا نہیں کہ پسرِ وزیر ہے، بادشاہ نے حکم قتل کا فرمایا۔ بعد از شفاعت ہوا خواہاں فرمایا کہ بیچ چاہ سلیمانی کے ڈالیں۔ میں شکر الٰہی بجالائی کہ یار میرا مارا نہ گیا اور میں رُسوائے خاص و عام نہ ہوئی۔ ہر روز آب و طعام بھیجتی تھی کہ گرسنگی سے ضائع نہ ہو۔ ایک رات میری خاطر میں گزرا کہ زندگی بے یار حیف ہے۔ فی الحال دو راس اسپ بادپائے سبک رفتار اور سلاح پاکیزہ اور دو خُرجین پُر از زر و جواہر لے کر بر سر چاہ آئی اور اُس عزیز کو نہ پایا لیکن نصیبے تیرے نے یاوری کی کہ مجھ سی شخص با دولت وزر میسر آئی۔"(18)

ان رنگین، مرصّع اور پُر تکلف عبارتوں کے ساتھ ساتھ اب نوطرزِ مرصّع کی وہ عبارتیں بھی ملاحظہ فرمایئے جو بے ساختہ طور پر مؤلف کے قلم سے نکل گئی ہیں۔ ان میں ایک طرح کی سادگی اور سلامت پائی جاتی ہے اور زبان بھی اپنے فطری مزاج کے مطابق صاف ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے یہاں مولف کا ذوقِ انشاپردازی عدیم الفرصتی کے سبب یا واقعہ نگاری کے بیانیہ تقاضوں کے تحت قدرے ماند پڑ گیا ہو گا اور اُن کی اختراعی قوت شل ہو گئی ہو گی۔ اس طرزِ بیان کی بھی دو مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

"ایک روز غلام میر ازار زار و بے قرار نہایت پُر اضطرار دوڑا ہوا آیا اور کہا کہ تمہارے دونوں بھائیوں کو ایک یہودی ضرب و شلاق کر رہا ہے۔ مشکیں بندھی ہیں اور تازیانے پڑتے ہیں۔ یوں بھائیوں سے تم نے جو دل سخت کیا ہے جانتے ہو اُن کا کیا حال ہو رہا ہے۔ یہ بات سن کر بے اختیار گھر سے بر آمد ہوا اور اُس معرکے میں آکر اس یہودی سے پوچھا کہ ان بندہ ہائے خدا نے کیا گناہ کیا ہے کہ اس قدر ظلم اور ستم تو روا رکھتا ہے۔ اُن نے در جواب کہا کہ اگر تجھ کو ان پر رحم آتا ہے تو تُو زر ہمارا دے اور ان کو چھڑا لے۔ میں نے اُسی وقت مبلغ خطیر دے کر ان کو چھڑا کر اپنے ڈیرے لایا اور علاج جراحت ہائے نہائی کا کر کے حمام میں نہایا اور خلعت پوشاک فاخرہ پہنایا"(19)

"دو روز کے بعد شب سویم کو نشہ شراب میں سرشار آئی اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اور پیالہ پی کر دائی سے کہا کہ یہ شخص بیچ غضب بُت بزرگ کے گرفتار ہو کر زندہ ہے یا مردہ۔ دائی نے کہا کہ ' رمقے از جان باقی دارد'۔ کہا کہ ہر چند نظروں سے گر گیا ہے لیکن یہ اس سے کہہ کہ باہر آوے۔ میں بہ مجرد طلب مست غضب کے سراسیمہ دوڑا گیا اور سلام کر کے ایک طرف کو کھڑا ہوا۔ بعد ایک ساعت کے خشمگیں نظروں سے دیکھ کر دائی سے کہا کہ اگر میں اس کو مار ڈالوں تو بُت بزرگ مجھ سے راضی ہووے۔ دائی نے کہا کہ یہ بہتر ہے مگر یہ بات بُت بزرگ ہی پر موقوف رکھیے۔ تب ملکہ نے یہ فرمایا کہ اس کو کہہ کہ بیٹھے۔ میں بموجب ارشاد کے بیٹھ گیا۔ ملکہ نے دائی سے کہا کہ اس کو شراب دے کہ وقت مرگ کے سختی نہ دیکھے۔ دائی نے ایک جام پُر از شراب گلفام میرے تئیں دیا۔"(20)

"نوطرزِ مرصّع" کی عبارتوں کے ان مختلف نمونوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولف نے قصہ چہار درویش کو فارسی کے مصنوع اسلوب کی پیروی میں رنگین ہندی زبان میں لکھنے کا جو بیڑہ اُٹھایا تھا اُس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہے لیکن یہ ایک ایسا تکلف تھا جسے وہ ہر جگہ نباہ نہیں سکے۔ مجبوراً انھیں بعض جگہ سادگی اختیار کرنا پڑی ہے مگر مجبوری کی اس سادگی میں وہ اُن فطری عناصر کو نہ سمو سکے جن کی وجہ سے میر امن کی سادہ عبارتوں میں حسن پیدا ہوا ہے۔ تحسین کے نزدیک فن کی معراج انشا کے اُن خارجی حربوں میں تھی، جنھیں شروع سے آخر تک نباہنا خاصا مشکل کام تھا۔ تاہم اُنھوں نے نوطرزِ مرصّع کو اپنے زمانے کے ادبی مذاق کے مطابق اُردوے معلّٰی کے لباسِ حریری میں پیش کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارا آج کا ادبی مذاق اُن کے اِس پُر تکلف اُسلوب پر ناک بھوں چڑھائے۔ نوطرزِ مرصع کے اسلوب کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے بالکل بجا ہے:

"جیسے آج نوطرزِ مرصع کی سی نثر نہیں لکھی جاسکتی اسی طرح شجاع الدولہ کے دور میں ایسی سادہ نثر لکھنا، جو طبقہ خواص کو بھی پسند ہو، ممکن نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نوطرزِ مرصع، جس تجربے کی نمائندگی کرتی ہے وہ دراصل آج ہمارا تجربہ نہیں ہے۔ جیسے "باغ و بہار" ایک خاص

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

ضرورت اور مقصد کے تحت لکھی گئی تھی اسی طرح "نوطرزِ مرصع" بھی خاص ماحول، معاشرے اور ضرورت کے تحت لکھی گئی تھی۔ اسی طرح نوطرزِ مرصع بھی خاص ماحول، معاشرے اور ضرورت کے تحت لکھی گئی تھی۔ باغ و بہار "صاحبانِ نوآموز" کو اُردو سکھانے کے لیے لکھی گئی تھی اور نوطرز مرصع نواب شجاع الدولہ کے حضور میں پیش کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس لیے تحسین نے ایک ایسا اُسلوب اختیار کیا جو اس دور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں اور طبقہ خواص کا دل پسند و محبوب اسلوب تھا۔ تحسین کا کمال یہ ہے کہ اس نے فارسی اسلوب کو اُردو کا اسلوب بنا کر اس طور پر پیش کیا کہ اہل علم کے ہاتھ اُردو کا ایک نیا معیاری اسلوب آگیا۔ اسی وجہ سے یہ اتنا مقبول ہوا کہ اس دور کے ادیبوں اور انشاپردازوں نے اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس دور میں اس اسلوب میں سحر کرنے کی پوری قوت تھی۔"(21)

فسانۂ عجائب از سرورؔ

مرصع و رنگین اردو نثر کا نقطۂ عروج "فسانۂ عجائب" کے مولف مرزا رجب علی بیگ المتخلص بہ سرور ولد مرزا اصغر علی بیگ، لکھنو کے رہنے والے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ رجب علی بیگ سرور لکھنو میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ آصف الدولہ اور ان کے بعد کے لکھنؤ کی تہذیب ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ اس تہذیب و ماحول میں پل بڑھ کر جوان ہوئے اور وہ سب کچھ کیا جو اس دور کا نوجوان کرتا تھا۔ حسن پرستی بھی اور شاعری بھی۔ تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی۔ البتہ جتنی کچھ تعلیم حاصل کی اس سے فارسی اچھی طرح آگئی اور عربی کی شدبد بھی ہوگئی۔ ہاں عالم نہ بن سکے۔ اردو ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔ بادشاہ و وزیر سے لے کر حقیر فقیر تک سب اسی زبان کو بولتے اور اس پر فخر کرتے تھے لکھنو کے شرفا کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی اور اہلِ ادب اس سے سند لیتے تھے(22)۔ سرورؔ نے اپنی تعلیم کے بارے میں لکھا ہے:

" نیرنگی زمانہ سے نہ عربی میں داخل ہوا، نہ فارسی میں کامل ہوا۔ دونوں سے ناآشنا رہا ایک کا بھی علم نہ حاصل ہوا۔ پست ہمتی سے اردو کے لکھنے میں اوقات بسر کی۔۔۔ کچھ دن نظم کا اہتمام رہا۔ شعر کہنے کا خیال خام رہا۔ جب وہ بھی نہ ہو سکا، نثر کی طرف خیال آیا۔"(23)

اسی خیال نے ان سے معروف و مقبول داستان "فسانۂ عجائب" تالیف کروائی جسے ادبا اور محققین اردو کی مرصع و رنگین نثر کا نقطۂ عروج قرار دیتے ہیں۔

سرور خطاطی میں بھی ماہر تھے اور اس فن میں محمد ابراہیم کے شاگرد تھے۔ شاعری میں وہ آغا نوازش حسین عرف مرزا خانی متخلص نوازش کے شاگرد تھے۔ نواب غازی الدین حیدر شاہ اودھ نے ۱۲۴۰ھ میں جلاوطنی کا حکم دیا تو وہ کانپور پہنچے۔ یہیں سرور نے "فسانہ عجائب" لکھ کر اپنے استاد کی خدمت میں "بہ طریقِ اصلاح" پیش کی جس کو دیکھ کر آغا نوازش نے ایک قطعہ تاریخ کہا جس سے سالِ تصنیف 1240ھ برآمد ہوتا ہے جو آج بھی فسانۂ عجائب کی زینت ہے(24)۔ سرورؔ "فسانۂ عجائب" کے دیباچے میں اس داستان کی تالیف کا سبب یہ لکھا ہے:

"ایک روز چند دوستِ صادق، محبِ موافق باہم بیٹھے تھے؛ مگر نیرنگیِ زمانۂ ناہنجار اور کج رویِ فلکِ سفلہ پرور، دوں نواز، جفاشعار سے سب بادلِ حزین وزار اور ہجومِ اندوہ و یاس سے اور کثرتِ حرمان و افکار سے۔۔۔ اداس تھے۔۔۔ اُس زمرے میں ایک آشنائے بامزہ بندے کے تھے، اُنھوں نے فرمایا: اس وقت تو کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسی بیان کر کہ رفعِ کدورت و جمعیت پریشانی طبیعت ہو۔۔۔ فرماں بردار نے بجز اقرار انکار مناسب نہ جانا، چند کلمے گوش گزار کیے۔ وہ باتیں انھیں بہت پسند آئیں، کہا: اگر بہ دل جمعی تمام تو اس پراگندہ تقریر کو، از آغاز تا انجام، قصے کے طور پر زبانِ اردو میں فراہم اور تحریر کرے، تو نہایت منظورِ نظر اہل بصر ہو۔ لیکن تقصیر معاف ہو، لغت سے صاف ہو۔۔۔ نیاز مند نے کہا: یہ تو مقدمۂ تحریر ہے؛ اگر سرِ سرکار کے کام آئے، جائے تقریر نہیں؛ مگر جلدی نہ کرنا، بہ وقتِ فرصت لکھوں گا۔۔۔ نیاز مند کو اس تحریر سے نمودِ نظم و نثر، جودتِ طبع کا خیال نہ تھا۔ شاعری کا احتمال نہ تھا۔ بلکہ نظرِ ثانی میں جو لفظ دقت طلب، غیر مستعمل، عربی فارسی کا مشکل تھا؛ اپنے نزدیک اسے دور کیا۔ اور جو کلمہ سہلِ ممتنع، محاورے کا تھا؛ رہنے دیا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا، فسانۂ عجائب اس کا نام رکھا۔"(25)

"فسانۂ عجائب" کے دیباچے میں اس داستان کی وجہ تصنیف کے حوالے سے رشید حسن خان کا خیال ہے کہ سرور نے اگرچہ صراحت نہیں کی، لیکن سارے قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ لکھنو کا واقعہ ہے۔ اب مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے پہل یہ داستان لکھنو میں، دوستوں کے اجتماع میں، ایک خاص دوست کی فرمائش پر، قصہ گویوں کے طرز پر زبانی بیان کی گئی تھی۔ البتہ دو باتیں وضاحت طلب رہ جاتی ہیں :1۔ یہ کس زمانے کا واقعہ ہے۔2۔ وہ آشنائے بامزہ کون تھے جن کی فرمائش پر یہ داستان سنائی گئی تھی۔ پہلی بات کے متعلق قیاساً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ زمانہ غازی الدین حیدر کی حکومت کا ہوگا۔ اس کا تعین فی الوقت نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ان کے اعلان بادشاہت سے پہلے کا واقعہ ہے یا اس کے بعد کا ہاں یہ مسلم ہے کہ یہ واقعہ ان کے سفرِ کان پور ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ (نومبر۔ دسمبر 1824ء) سے پہلے کا ہے۔ اب رہی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

دوسری بات، سواُس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ سرور نے بہ طورِ خود صراحت نہیں کی، اور اس وقت تک جو معلومات سامنے آئی ہے اُس کی مدد سے بھی اُن "آشنائے بامزہ" کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی۔ البتہ سرور نے اُن کے لیے جو لفظ استعمال کیے ہیں، اُن سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ اُن کے عام حلقۂ احباب سے الگ، وہ کوئی خاص دوست تھے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعتِ اول [نسخۂ ح] میں وجہ تصنیف کے حصے کا عنوان اس طرح قائم کیا گیا تھا: "باعث تحریر اجزائے پریشان و سرگذشت مجمع دوستان، مکلف ہونا محبوب کا"، بیان داستان مرغوب کا [نسخۂ ح، ص ۱۷] ۔ اس میں "مکلف ہونا محبوب کا" توجہ طلب نظر آتا ہے۔ پہلی بار نظر ثانی کردہ اشاعت دوم [نسخۂ ض ۱۲۶۳ھ] میں بھی یہ عبارت اسی طرح باقی رہی۔ جب دوسری بار سرور نے اس کتاب پر نظر ثانی کی اور یہ نسخہ ۱۲۶۷ھ میں چھپا [نسخہ ک] تو سرور نے عنوان کی عبارت میں تبدیلی کی اور محبوب کو صاحبِ فرمایش سے بدل دیا۔ اس کے بعد جب تیسری بار اس کتاب پر نظر ثانی کی اور یہ نسخہ 1276ھ میں چھپا [نسخۂ ف] تو اس نسخے میں اشاعت اول والی عبارت کو برقرار رکھا، یعنی "مکلف ہونا محبوب کا" برقرار رہا۔ آخری بار جب نظر ثانی کی اور یہ نسخہ ۱۲۸۰ھ میں چھپا [نسخہ ل] تو اس نسخے میں ۱۲۶۷ھ والی عبارت کو واپس لے آیا گیا آخری ٹکڑے کی تبدیلی کے ساتھ، یعنی اس میں "محبوب" کی جگہ پھر "صاحبِ فرمایش" نے لے لی۔(26)

فسانۂ عجائب کے سالِ تصنیف کا جائزہ لیا جائے تو غازی الدین حیدر (1814ء۔1827ء) کے دور میں ۱۲۴۰ھ میں شروع ہوا اور ۱۲۴۰ھ ہی میں اختتام کو پہنچا۔ غرض ۱۲۴۰ھ سے ۱۲۵۹ھ تک فسانۂ عجائب قلمی نسخوں کی صورت میں گردش کرتا رہا اور جب اس کی طباعت کی نوبت آئی تو سرور نے اس پر نظرِ ثانی کر کے طباعت کے لیے تیار کیا اور تصنیف کے انیس سال بعد "فسانہ عجائب" پہلی بار میر حسن رضوی کے مطبع حسنی لکھنو سے جمادی الثانی ۱۲۵۹ھ/جولائی ۱۸۴۳ء میں شائع ہوا۔ رشید حسن خان نے فسانۂ عجائب کے اہم مطبوعہ نسخوں کی جو فہرست مرتب کی ہے ان میں وہ پانچ ایڈیشن شامل ہیں جن پر اشاعت سے پہلے سرور نے نہ صرف نظر ثانی کی بلکہ ہر ایک کے آخر میں خاتمے کی نثر بھی لکھی ہے۔(27) اب تک فسانۂ عجائب کے بے شمار ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور آج تک چھپتے چلے آرہے ہیں ۔ اس داستان کا اہم ترین نسخہ وہ ہے جو مصنف کی زندگی میں آخری بار، مصنف کی نظر ثانی کے بعد، ۱۲۸۰ھ میں مطبع افضل المطابع لکھنو سے شائع ہوا اور جسے بنیاد بنا کر رشید حسن خاں نے مرتب کر کے انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی سے 1990ء میں شائع کیا ہے۔

فسانۂ عجائب کو ڈاکٹر گیان چند جین شمالی ہند کی پہلی اہم طبع زاد داستان تسلیم کرتے ہیں لیکن اس داستان کے مختلف حصے اس دور کی دوسری داستانوں سے کشید کیے گئے ہیں۔ ان مماثلات کے پیشِ نظر ان کا خیال ہے کہ فسانۂ عجائب تصنیف کرتے وقت سرور کی نظر میں تمام رائج الوقت قصے تھے۔ انھوں نے خاص طور پر گلشنِ نو بہار، بہارِ دانش، پدماوت اور داستانِ امیر حمزہ سے اپنا چراغ روشن کیا غرض فسانۂ عجائب کے اہم واقعات میں تبدیلیِ قالب کے سوا کوئی ایسا خیال نہیں جو فرسودہ قصوں سے ممتاز ہو(28)۔ فسانۂ عجائب کے افسانوی پہلوؤں کا تجزیہ ہمارے موجودہ مطالعے کی حدود سے باہر ہے۔ اس لیے ہم اپنے جائزے کو اُسلوبِ نگارش کی بحث تک محدود رکھیں گے۔

"فسانۂ عجائب" کے اسلوبِ نگارش کے مطالعے سے دو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں ایک یہ کہ سرور نے اس داستان کو مرصع و رنگین لکھنے کا اعتراف خود اس کے دیباچے میں کیا ہے، دوسرا یہ کہ تمام داستان (دیباچے کے علاوہ) میں وہ اپنے اس اعتراف پر عمل پیرا نہیں ہو سکے ہیں اور ہمیں اس داستان میں تکلف و تصنع سے ہٹ کر وہ روزمرہ اور محاورہ بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے جو اس دور کے شرفاے لکھنو کا تھا۔ سرور نے اس داستان یا قصّے کو روزمرہ کے پیرائے میں لکھنے اور اس کی ضرورت و افادیت کا اظہار دیباچے میں دوستوں کی فرمایش کے ضمن میں یوں کیا ہے:

> "اگر بہ دل جمعیِ تمام تُو اس پراگندہ تقریر کو، از آغاز تا انجام، قصے کے طور پر زبانِ اردو میں فراہم اور تحریر کرے تو نہایت منظورِ نظر اہلِ بصر ہو۔ لیکن تقصیر معاف ہو، لغت سے صاف ہو۔ بندے نے کہا: طبیعتِ ابناے روزگار بیش تر متوجہ عیب جوئی و ہنر پوشی ہے،۔۔۔ وہ بولے: چشمداشت صلہ، طلبِ اجرت کسی سے متصور نہیں، فقط ہماری خوشی مدِ نظر رکھ۔ جیسا رطب و یابس کہے گا، ہمیں پسند ہے؛ بہ شرطے کہ جو روز مرہ اور گفتگو ہماری تمھاری ہے، یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینی عبارت کے واسطے دقت طلبی اور نکتہ چینی کریں، ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں۔"(29)

آگے چل کر سرور مزید لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

"نیاز مند کو اس تحریر سے نمودِ نظم و نثر، جودتِ طبع کا خیال نہ تھا۔ شاعری کا احتمال نہ تھا۔ بلکہ نظرِ ثانی میں جو لفظ دقت طلب، غیر مستعمل، عربی فارسی کا مشکل تھا؛ اپنے نزدیک اسے دور کیا۔ اور جو کلمہ سہلِ ممتنع، محاورے کا تھا؛ رہنے دیا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا، فسانۂ عجائب اس کا نام رکھا۔"(30)

فسانۂ عجائب کے دیباچے کی تحریر کے تناظر میں دیکھا جائے تو "فسانۂ عجائب" کو سادہ اور سلیس اردو نثر میں ہونا چاہیے تھا لیکن رجب علی بیگ سرور اسی مرصع و رنگین اردو نثر سے پہچانے جاتے ہیں جس میں اس دور کی لکھنوی تہذیب کی روح سمائی ہوئی ہے۔ یہ نثر نہ فورٹ ولیم کالج کی نثر کا رنگ دکھاتی ہے اور نہ میر امن سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے۔ بلکہ سرور نے تو خود اپنے دیباچے میں میر امن پر "باغ و بہار" کے اُسلوب کے حوالے سے حملہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ "اُس وقت یہ کلمہ تو سن طبع کو تازیانہ ہوا، تحریر کا بہانہ ہوا۔ اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے یا اس فسانے کو بہ نظرِ بنظاری کسی کو سُنائے۔ اگر شاہ جہاں آباد کہ مسکنِ اہلِ زباں، کبھی بیت السلطنت ہندوستاں تھا؛ وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا؛ اُن سے تحصیلِ لاحاصل ہوتی، تو شاید اس زبان کی کیفیت حاصل ہوتی۔ جیسا میر امن صاحب نے قصہ چار درویش کا "باغ و بہار" نام رکھ کے خار کھایا ہے، بکھیڑا مچایا ہے کہ ہم لوگوں کے دہن، حصّے میں یہ زبان آئی ہے؛ مگر بہ نسبت مولفِ اول عطا حسین خاں کے، سو جگہ منہ کی کھائی ہے۔ لکھا تو ہے کہ ہم دلّی کے روڑے ہیں ؛ پر، محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر۔ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے ۔ بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے۔ کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔"(31) یہی وجہ ہے کہ اس قصے میں شعوری طور پر پُر تکلف اور پُر تصنع اُسلوب کو برتا گیا ہے۔ چونکہ اس داستان کا براہِ راست تعلق اس فضا، اس ماحول اور اس مغلیہ تہذیب سے ہے جو لکھنؤ کے اُس تہذیبی جزیرے میں پروان چڑھی تھی اور جس نے آغاز ہی میں نوطرزِ مرصع میں اپنے جمال کی جھلک دکھا کر آصف الدولہ کے والد شجاع الدولہ کو مسرور کیا تھا۔ لہٰذا "فسانۂ عجائب" بھی اسی روایت کی ترقی یافتہ شکل ہو سکتی تھی جس کا خاصہ یہ تھا کہ بات سے زیادہ بات کہنے کے انداز پر توجہ دی جاتی تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ذرا سی بات کو عبارت آرائی سے بے جا طول دے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا جاتا تھا اور حقیقتِ حال کے اظہار سے زیادہ قوتِ متخیلہ کی بے محابا پرواز پر تکیہ کیا جاتا تھا اور تحریر میں فطری جذبے کی موجودگی ضروری نہ تھی، البتہ جذبات کے خارجی مظاہر کا میکانکی بیان کافی سمجھا جاتا تھا۔ دور از کار تشبیہات اور پیچ در پیچ استعارات سے عبارتوں کو سجایا جاتا تھا۔ بلند آہنگ تراکیب اور اضافتوں کی کثرت سے فقروں کو طویل، پیچدار اور بارعب بنایا جاتا تھا۔ محاسن و معائب کے بیان میں حد درجہ مبالغہ کو ضروری سمجھا جاتا اور مناظر کشی میں موقع کی حقیقی جزئیات پیش کرنے کے بجائے ترصیع کا انداز اختیار کیا جاتا تھا۔ صنائع لفظی و معنوی کے جا و بے جا استعمال اور قافیے اور سجع کے التزام پر لکھنے والے کی خصوصی توجہ رہتی تھی۔ یہ امور فارسی کے مصنوعی اور پُر تکلف اسلوب کے نمایاں اوصاف اور انشاپردازی کے لوازم سمجھے جاتے تھے اور سرور بھی تحسین کی طرح اسی روایت کے پروردہ تھے۔ لکھنوی تہذیب جو اندر سے کھوکھلی اور بظاہر چمکدار تھی، یہاں کے شعر و ادب پر چھائی ہوئی تھی۔ سرور کی فسانۂ عجائب بھی اسی تہذیب کی نمائندہ تھی۔ مرصّع و رنگین فارسی اُسلوب کا مرعوب کن انداز ہمیں سرور کے ہاں بھی اسی لیے نظر آتا ہے کہ تکلف و تصنع کا احساس اس تہذیب کی ہر نوع میں جھلکتا ہے۔ فسانۂ عجائب کے اسلوب کو بھی اس تہذیبی رویے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ فسانۂ عجائب کے اُسلوب کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> "عربی فارسی کی افراط، مقفیٰ و مسجع فقرے، استعاروں کی نکتہ سنجی، ابہام کی موشگافی، مبالغے کا زور اور اطنابِ بے جا فسانۂ عجائب کے اسلوب کے عناصرِ ترکیبی ہیں۔ اردو نثر کے لیے یہ مسلک نیا نہ تھا فضلی کی کربل کتھا، سودا کا دیباچۂ دیوان اور تحسین کی نوطرزِ مرصع میں کم و بیش یہی رنگ ہے، لیکن ان میں توازن کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ سرور نے حربوں کو سلیقے سے استعمال کیا۔ منظر نگاری ہو یا جذبات نگاری سرور نے اپنی وضع کبھی ترک نہ کی۔"(32)

"فسانۂ عجائب" کا طویل دیباچہ آغاز تا اختتام رنگینی اور عربی و فارسی کے الفاظ سے مرصع کیا گیا ہے۔ انھوں نے "دوست آشنائے بامزہ" کی خوشی کو بھرپور عبارت آرائی سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح داستان میں شامل مختلف قصوں یا حصوں کے بیان میں بھی عبارت آرائی کی بھرپور کوشش ملتی ہے جس میں سرور نے تحسین کی طرح شعوری کوشش اور مشقت کا خاصا اہتمام کیا ہے۔ داستان کے ہر ہر حصے کو مرصع و رنگین تلازمات سے مزین کرنے میں مصنف نے بڑی عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے۔ اس داستان میں بھی جگہ جگہ تشبیہوں، استعاروں اور صنائع بدائع کا التزام کر کے عبادت کو سجانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فارسی ترکیبوں اور اضافتوں کے ذریعے فقرے طویل اور پیچدار صورت اختیار کرتے ہوئے پڑھنے والوں کو بیان کی بھول بھلیوں میں پھنساتے نظر آتے ہیں۔ عربی اور فارسی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ سے مصنف قاری پر اپنی علمیت اور زباں دانی کا خوب رعب جماتا ہے۔ نہ صرف یہ بھاری بھر کم الفاظ، بلکہ جملوں اور فقروں کی ترکیب بھی فارسی قواعد و انشا کے تانے بانے پر اٹھائی گئی ہے۔ اس

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

داستان کی عبارتوں کی عبارتیں پڑھتے جایئے،اُس میں اُردو پن کا بہت کم احساس ہوتا ہے اور یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ اس اختراعی کوشش میں سرور کو خاصی محنت و مشقت کرنی پڑ رہی ہے۔

یہ اختراعی کوشش اُس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب داستان کے واقعات کے بیان میں دقیق، پیچیدہ اور رنگین عبارتوں کے بجائے کہانی از خود سادا و سلیس بیانیہ انداز اختیار کرتی نظر آتی ہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس داستان کو مصنف بڑے تکلف و اہتمام کے ساتھ اُسلوب کا رنگین و مزین جامہ پہنانے کے لیے شروع کرتے ہیں وہ اپنے فطری تقاضوں کے تحت کہیں کہیں صنعت گری کے پُر تکلف دائرے سے باہر ہو کر سادگی و روانی کی عام پسند شاہراہ پر نکل آتی ہے۔کیونکہ داستان بنیادی طور پر بیانیہ اندازِ نگارش کی مقتضی ہوتی ہے اور واقعہ نگاری میں تکلفات کا التزام اس کے قصے پن کو مجروح کرتا ہے۔تاہم عبارت آرائی کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے واقعات کے بیان میں روانی کا ہونا فطری امر ہے۔ فسانۂ عجائب میں بھی مصنف ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہوئے ہیں۔یعنی اس داستان کے بیان میں ہمیں دو رنگوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ایک ایسا رنگ جو فارسی کے تتبع میں علمیت اور زبان دانی کا رعب جماتا ہے۔یہ رنگ ہمیں دیباچے اور داستان کے ہر باب کے ابتدائی حصے میں نظر آتا ہے اور دوسرا رنگ وہ جب قصہ آگے بیان ہوتا ہے تو اس میں سادگی اور روانی آتی چلی جاتی ہے۔ سرور کے اس امتزاجی اُسلوب کے ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> "فسانۂ عجائب اپنے اسلوبِ بیان ہی کی وجہ سے، منفرد کتاب نہیں ہے بلکہ لکھنو کے تعلق سے بھی اسے "کتاب التہذیب" کہنا چاہیے۔۔۔فسانہ عجائب کو پڑھا جائے تو یہ اسلوب بیان دو رنگوں میں سامنے آتا ہے۔ایک وہ جو دیباچے اور ہر باب کے ابتدائی چند جملوں یا گاہ گاہ منظر کے بیان میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے، جس پر نہ صرف عربی و فارسی الفاظ کی گہری روایتی چھاپ ہے بلکہ اس کی مسجع و مقفیٰ عبارت اپنی پوری رنگینی کے ساتھ جلوہ دکھاتی ہے لیکن یہ اسلوبِ بیان صرف دیباچے اور انھیں حصوں تک محدود ہے۔دوسرا اسلوبِ بیان، جیسے ہی قصہ ذرا آگے بڑھتا ہے، سامنے آنے لگتا ہے۔اس اسلوب میں رنگینی موجود ہے لیکن یہ رنگینی سادگی سے ملی ہوئی ہے اور اس زبان سے قریب تر ہے، جو شرفائے لکھنو بولتے تھے۔شعر و شاعری اس معاشرے کا تہذیبی مزاج تھا اور اسی لیے شاعری اس دور میں زندگی کی سب سے اہم سرگرمی سمجھی جاتی تھی۔سرور خود اسی تہذیب کے آدمی تھے۔انھوں نے نثر میں شاعری پیدا کر کے اسے ایک ایسا انوکھا رنگ دیا ہے کہ یہ تہذیب ''فسانہ عجائب'' کے اسلوبِ بیان اور طرزِ فکر میں سمٹ آتی ہے۔"(33)

اولاً سرور کے رنگین اُسلوب کے چند اقتباسات کو پیش کیا جائے گا جو "فسانۂ عجائب" کے ہر باب کے آغاز میں مرصع اور رنگین نثر کی صورت میں موجود ہیں۔مثال کے لیے چند عبارتیں دیکھیے:

> "گرہ کشایان سلسلہ سخن و تازہ کنندہ گان فسانہ کہن یعنی محرران رنگین تحریر و مورخان جادو تقریر نے اشب جہندۂ قلم کو میدان وسیع بیالین ہا کر شمۂ سحر ساز و لطیفہائے حیرت پرواز گرم عنان و جولان یون کیا ہے کہ سرزمین ختن ہیں ایک شہر تھا مینو سواد بہشت نژاد پسند خاطر محبوبان جہان قابل بود و باش خوبان زبان شمیم صفت اُس کی مُعطر کن دماغ جان مسکن الہتاب قلب دافع خفقان زمین اُس کی رشک چرخ برین رفعت و شان چشمک زن بلندی فلک ہفتمیں گلی کوچہ نجلت دہ گلشن آبادی گلزار یسان تختہ چمن بازار ہر ایک بے آزار مصفا ہموار دو کا تین نفیس مکان نازک پائدار خلق خدا باخاطر شاد اُسے نسخت آباد کہتے تھے۔"(34)

> " بادیہ پیمایان مراحلۂ محبت و صحرا نوردانِ منازلِ مودت؛ رہروانِ دشتِ اشتیاق و طے کنندگانِ جادۂ فراق؛ مسافرانِ بارِ ناکامی بر دوش، بجز راہِ کوچۂ یار دین و دنیا فراموش؛ عشق سر پر سوار، خود پیادہ، زیست سے دل سیر، مرگ کے آمادہ لکھتے ہیں کہ جب بہ ایں ہیئت کذائی، وہ پر وردۂ دامنِ ناز و آغوشِ شاہی گھر سے نکلا اور درِ شہر پناہ پر پہونچا۔"(35)

> "یہاں سے دشت نوردانِ وادیِ سخن جگر افگار غربت زدگانِ پُر محن سینہ ریش با پائے زخم دار و دلِ خار خار بیان کرتے ہیں کہ وہ مسافرِ صحرائے اندوہ و حرمان، عازمِ سمتِ جاناں؛ بے توشہ و زادِ راہ، ہر روز با دلِ پُر سوز کراہ کراہ؛ بادیہ گردی کرتا، جیتا نہ مرتا؛ ایک روز نواحِ دل کشاد صحرائے فرح افزا میں گزر۔دیکھا کہ باغبانِ قدرت نے صفحۂ دشت گل ہائے مختلف رنگ، بو قلموں سے بہشتِ ہشتم، رشکِ صحنِ چمن اور بوٹا پتا گھانس کا بہ از گلِ باغِ ارم، نجلت دہ نسرین و نسترن کر دکھایا ہے گرد جدولِ آبِ روان۔چشمہ ہر ایک چشمۂ حیوان اور لکہ ہائے ابر نے چھڑکاؤ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

سے عجب رنگ جمایا ہے نسیمِ بہار اور درختِ گل دار سے میدان رشکِ ختن و تاتار ہے۔ نہ کہیں گرد ہے نہ غبار ہے۔ درختوں پر فیضِ ہوا اور ترشح سے سرسبزی اور چمک کا جوبن ہے۔ گل ہائے خودرو سے جنگل نمونۂ گلشن ہے۔"(36)

"سنو پھر اُسی غمز دے کا بیان۔ طلسم کشایانِ گنجینۂ سخن، فخرِ سامری ورہ نوردانِ اقلیم حکایات کہنِ مشتاقِ جادو و شعبدہ گری؛ رسامانِ جفا کش و محنت کشیدہ؛ سحر سازانِ سُخن سنج، درین سرائے سپنج روے راحت ندیدہ گو سالہ سُخن کو دیرِ خراب آباد میں یون گویا کرتے ہیں۔"(37)

"آشنایانِ بحرِ تقریر و غواصانِ محیطِ تحریر، شناورانِ شطِ الفت غریقِ لجہ محبت نے گوہر آب دارِ سُخن کو سلکِ گفتار میں منسلک کر کے زیبِ گوشِ سامعانِ ذی ہوش اس طرح کیا ہے کہ بعد فتحِ جنگ جادو شہپال اور ہاتھ آنے خزانۂ مالا مال کے، دو مہینے تک تفریحاً لشکر نصرت اثر شب و رُوز اُس دشت میں جلوہ افروز رہا"(38)

"نگارندۂ حال غریقِ شطِ فرقت و کشتی شکستہ لجۂ محبت، بادبانِ گسستہ صرصر دوری و لنگر بُریدہ کاردِ مہجوری، طوفان رسیدہ، کنار کام یابی نہ دیدہ، یعنی ملکہ مہر نگار خامۂ جگر افگاریوں رقم کرتا ہے۔"(39)

اسی طرح مناظر کے بیان میں بھی زیادہ تر مقامات پر ہمیں فطری انداز کے بجائے مرصع رنگ نظر آتا ہے اور منظر سے لطف لینے کے بجائے قاری مرصع الفاظ، رنگین تلازمات اور پیچ و خم میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

"ان کا گزر ایک دشتِ عجیب صحرائے غریب میں ہوا۔ ہر تختہ جنگل کا بہ روشِ باغ تھا؛ جو پھول پھل تھا؛ تازہ کن دل، معطر نمائے دماغ تھا۔ جہاں تک پیکِ نگاہ جاتا، بجز گل ہائے رنگین و یاسمن و نسرین اور کچھ نظر نہ آتا۔ شہ زادہ شگفتہ خاطری سے صناعی باغبانِ قضا و قدر کی دیکھتا جاتا تھا۔ ناگاہ ایک سمت سے دو ہرن برق وش، صبا کردار، سبک جست، با چشمِ سیہ مست، تیز رفتار سامنے آئے۔ زربفت کی جھولیں پڑیں، جڑاؤ سنگوٹیاں جڑیں۔ گلے میں مغرق ہیکلیں مثلِ معشوقِ طناز عربدہ ساز، سر گرمِ خرام ناز، چھم چھم کرتے چوکڑیاں بھرتے۔"(40)

"۔۔۔ ریت کی گرمی سے تلوے جلتے تھے۔ دو گام قدم نہ چلتے تھے۔ لوں کا شعلہ یہ سر گرمِ آزارِ جگر سوختگاں تھا کہ پرندے پتوں میں منہ چھپاتے تھے۔ کوسوں دَوِندے نظر نہ آتے تھے۔ دشت، کورہ آہنگراں تھا۔ ہر طرف شعلہ جوالہ دواں تھا۔ ریگِ صحرا کیفیتِ دریا دکھاتی تھی، پیاسوں کی دوڑ دھوپ میں جان جاتی تھی۔ صدائے زاغ و زغن سے سناٹا، دھوپ کا تڑاقا۔ دشت کا پتھر تپنے سے انگارا تھا۔ جانور ہر ایک پیاس کا مارا تھا۔ وہ تابشِ شمس جس سے ہرن کالا ہو، مذکور سے زبان میں چھالا ہو۔ بادِ سموم سے وحشیوں کے منہ پر سیہ تاب تھا۔ لوں سے گاوِ زمیں کا جگر کباب تھا۔ سیپیوں نے گرمی کے مارے لب کھولے تھے۔ حبابِ دریا کی چھاتی میں پھپھولے تھے۔ ہر ذی حیات حرارت سے بے تاب تھا۔ سوا نیزے پر آفتاب تھا۔ مچھلیاں پانی میں بھنتی تھیں، جل جل کر کنارے پر سر دُھنتی تھیں۔ سر طانِ فلک جلتا تھا۔"(41)

باغ کے منظر کا بیان دیکھیے جس میں تصویر کے بجائے قاری قافیہ پیمائی، تشبیہ و استعارہ عربی و فارسی تراکیب، غرض تصنع کی بھول بھلیوں میں ڈوب جاتا ہے:

"بہت آراستہ و پیراست۔ عرض مربع میں۔ چاروں کونوں پر چار بنگلے، گرد سبزۂ نوخاستہ۔ دروازہ عالی شان۔ نفیس مکان۔ زیرِ دیوار خندق پر کیلے، اکیلے نہیں؛ قطار در قطار۔ تختہ بندی کی بہار۔ روش کی پڑیاں قرینے کی۔ مہندی کی ٹٹیوں میں نے رنگت مینے کی۔ گل منہدی سرخ، زرد پُر افشان۔ عباسی کے پھولوں سے قدرتِ حق نمایاں۔ نرگس دیدۂ منتظر کی شکل آنکھیں دکھاتی تھی۔ گلِ شبو سے بھینی بھینی بو باس آتی تھی۔ میوہ دار درخت یک لخت جدا۔ بار کے بار سے ٹہنیاں جھکیں، درخت سر کشیدہ۔ پھل لطیف و خوش گوار۔ پھول نازک و قطع دار۔ روشیں بلور کی۔ نہریں نور کی۔ حوض و نہر میں فوارے جاری۔ چمنیوں میں بادِ بہاری۔ موسم کی تاک میں، تاک کا مستوں کی روش جھومنا۔ غُنچۂ سربستہ کا منہ تاک تاک کے، نسیم کا چومنا۔ انگور کے خوشوں میں دلِ آبلہ دار کا پتا۔ زربفت کی تھیلیاں چڑھیں، نگہبانی کو گوشوں میں باغبانیاں المست کھڑیں۔ ہر تختہ ہرا بھرا۔ روش کے برابر چینی کی ناندوں میں درختِ گل دار معنبر و معطر۔ بیلا، چنبیلی، موتیا، موگرا، امدن بان؛ جوہی، کینتکی، کیوڑا، نسرین و نسترن کی نرالی آن بان۔ ایک سمت تختوں میں لالہ خوفِ خزاں سے بادلِ داغ دار؛ گرد اُس کے نافرمان کی بہار۔ سرو، شمشاد لبِ ہر جُو؛ فاختہ اور قُمری کی اُس پر کُو کُو، حق سرہ۔ شاخِ گل پر بلبلِ شوریدہ کا شور۔ چمن میں رقصاں مور۔ لہیں خندہ کبکِ دری، کہیں تدرو بر سرِ جلوہ گری۔ نہروں میں قاز بلند آواز، تیز پرواز۔ کسی جابط اپنے ولولے میں خود غلط۔ ایک طرف قرقرے۔ دو رویہ درخت گل و بار سے بھرے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

سیب سے زنخِ گل غداروں کی کیفیت نظر آتی۔ ناشپاتی اور بہی آسیب ِ دستِ باغباں سے بَری۔ ہر شاخ ہری۔ سُنبل مسلسل میں پیچ وتاب زُلفِ مہ وشاں کا ڈھنگ۔ سُوسن کی اُداہٹ مسی لب خوب رویوں کا جوبن دکھاتی۔ داؤدی میں صنعتِ پروردگار عیاں۔ صد برگ میں ہزار جلوے نہاں۔ آم کے درختوں میں کیریاں زُمرد نگار۔ مولسری کے درخت سایہ دار۔"(42)

"ناگاہ ایک روز گذر موکبِ باحشمت و جلال، فرد و شوکت کمال، ایک صحرائے باغ و بہار، دشتِ لالہ زار بے ملال میں ہوا، فضائے صحرا قابلِ تحریر، کیفیتِ دشتِ گلشن آسا لایقِ تقریر۔ بو باس ہر برگ و گل کی رشکِ مشکِ اذفر۔ صفحۂ بیابان معنبر و معطر۔ چشموں کا پانی صفا میں آبِ گہر سے آب دار تر، ذایقے میں بہ از شیر و شکر۔ چلے کے جاڑے، کڑاکے کی سردی تھی ؛ گویا کہ زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی ۔ پرند اور چرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں جمے ہوئے بیٹھے، بھوک اور پیاس کے صدمے اٹھاتے تھے، دھوپ کھانے کو باہر نہ آتے تھے، قصد سے تھر تھراتے تھے۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا، دمِ تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا۔ آواز کسی کی کان تک کسی کے کم جاتی تھی، منہ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی۔ مارِ سیاہ اوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا، سردی کے باعث دم دبا کے بانبی میں دبکا جاتا تھا۔ زمانے کے کاروبار میں خلل تھا، ہر ایک دست در بغل تھا۔ عاشق و معشوق بھی اگر ساتھ سوتے تھے ؛ گھٹے تھے، مگر گھٹنے پیٹ سے جدا نہ ہوتے تھے۔ اشکِ شمعِ انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا۔"(43)

اسی طرح کرداروں کے جذبات کے بیان اور اُن کے مکالمات میں رنگین بیانی، اس داستان کا امتیازِ خصوصی ہے۔ اس حوالے سے ملکہ کے احوال کا بیان دیکھیے:

"ہاتھ پاؤں سنسناتے ہیں، خود بہ خود غش چلے آتے ہیں۔ دم سینے میں بند ہے، گھبراتا ہے، مکان کاٹے کھاتا ہے۔ باغ ویران، گل و بوٹا خار معلوم ہوتا ہے۔ گھر زنداں، بات کرنا بے کار معلوم ہوتا ہے۔ جان بے قرار ہے، بند بند ٹوٹتا ہے۔ دامنِ صبر دستِ استقلال سے چھوٹتا ہے۔ جنگل پسند ہے۔ ویرانے کا جی خواہش مند ہے۔ دشت کا سناٹا بھاتا ہے۔ بلبل کا نالہ دل دکھاتا ہے۔ خدا جانے کس کی جستجو ہے، دل کو مرغوب قمری کی کو کو ہے۔ تنہائی خوش آتی ہے، آدمیوں کی صورت سے طبیعت نفرت کھاتی ہے۔ سینہ جلتا ہے، دل کو کوئی مسوس کر ملتا ہے۔ آنکھ ظاہر میں بند ہوئی جاتی ہے، مگر نیند مطلق نہیں آتی ہے۔ ہاتھ چاہتے ہیں سرِ دست چاکِ گریباں دیکھیں۔ پاؤں چل نکلے ہیں کہ بیاباں دیکھیں۔ نل و دمن کی مثنوی سے ربط ہے۔ لیلی و مجنوں کا قصہ پڑھتی ہوں، یہ کیا خبط ہے۔ دل کی تمنا ہے کہ بے قراری کر۔ آنکھیں اُمڈی ہیں کہ اشک باری کر۔ جہان کی بات سے کان پریشان ہوتے ہیں، مگر جانِ عالم کا ذکر دل لگا کر سنتی ہوں۔ جو کوئی سمجھاتا ہے؛ رونا چلا آتا ہے، سر دھنتی ہوں۔ ناکامی، مجھے خستہ و پریشاں کا کام ہے۔ آہ، مجھ بے سر و ساماں کا تکیہ کلام ہے۔ منہ کی رونق جاتی رہی، زردی چھا گئی، بہارِ حسن پر خزاں آ گئی۔"(44)

"شہ زادے نے عرض کی : یہ تخت و سلطنت حضور کو مبارک رہے۔ بندہ آوارہ خانماں، ننگِ خاندان، گھر کی حکومت و ثروت چھوڑ، عزیزوں سے منہ موڑ، خراب و خستہ، سر گرداں، در در حیران و پریشاں ہو یہاں تک پہنچا؛ اب یہ کلمہ ہتک اور ذلت کا سننے کو جیتا رہوں، ملک بیگانے میں بادشاہت کروں۔ لوگ کہیں : جادو گر تو شہ زادی کو لے گیا؛ یہ شخص بے غیرت تھا، جیتا رہا، سلطنت کرنے لگا۔ جواں مردی سے بعید ہے۔ عاشق کو معشوق کی راہ میں جان دینا عید ہے۔"(45)

مذکورہ بالا عبارتوں کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے شعوری کوشش سے قصّے کے بیان، اس میں موجود مناظر کے بیان، واقعات کے بیان، غرض کرداروں کی گفتگو میں عبارت آرائی کی خاطر تراکیب، تشبیہ واستعارات، محاورات، رعایتِ لفظی، صنائع بدائع، عربی و فارسی کے دقیق اور نامانوس الفاظ اور مرصّع فقروں سے اس قصے کو مرصع کیا ہے۔ داستان کی مختلف عبارتوں کو دیکھا جائے تو مصنوعی انداز اور فطری طرز کا فرق از خود واضح ہو جائے گا۔

اس داستان کا دوسرا رنگ وہ ہے جب قصہ آگے بیان ہوتا ہے تو اس میں سادگی اور روانی آتی چلی جاتی ہے۔ سرور کے اس امتزاجی اُسلوب کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہاں داستان کی ایک ضمنی حکایت، جو بندر کے بیان میں ہے۔ نسبتاً رواں نثر میں ہے، دیکھیے:

"بندر نے کہا: سرزمینِ یمن میں ایک بادشاہ تھا۔ ملک اُس کا مالا مال، دولت لازوال۔ بخشندہ تاج و تخت، نیک سیرت، فرخندہ بخت۔ جس دم سائل کی صدا گوشِ حق نیوش میں در آئی، وہیں احتیاج پکاری: میں بر آئی۔ یہاں تک کہ لقب اس کا نزدیک و دور "خداداد دوست" مشہور ہوا۔ ایک روز کوئی شخص آیا اور سوال کیا کہ اگر تو خداداد دوست ہے، تو للہ تین دن کو مجھے سلطنت کرنے دے۔ بادشاہ نے فرمایا: بسم اللہ جو اراکینِ سلطنت،

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

مسند نشینِ حکومت حاضر تھے؛ بہ تاکید انھیں حکم ہوا کہ جو اس کی نافرمانی کرے گا، موردِ عتاب سلطانی ہو گا۔ یہ فرما، وہ فرماں واں تخت سے اُٹھا، سائل جا بیٹھا، حکم رانی کرنے لگا۔"(46)

اسی طرح انجمن آرا کی رخصتی کے وقت اُس کی والدہ کے جملے ملاحظہ فرمایئے:

" یہ کہ کے، بادشاہ دیوانِ عام میں رونق افزا ہوا۔ انجمن آرا کو ماں نے طلب کیا اور دو چار مغلانیاں، آتو سن رسیدہ، محلداریں جہاں دیدہ، قدیم جو تھیں، اُنھیں بُلایا۔ شہر زادی کی جلیسیں بھی، یہ خبر سن کر، بے بُلائے آئیں۔ اُس نے پہلے بیٹی کو گلے سے لگایا، پیار کیا، پھر کہا: سنو پیاری! دنیا کے کارخانے میں یہ رسم ہے کہ بادشاہ کے گھر سے فقیر تک، بیٹی کسی کی، ماں باپ پاس ہمیشہ نہیں رہتی۔ اور غیرت رت دار کے گھر میں لڑکی جوان، ہر وقت رنج کا نشان، خفت کا سامان ہے۔ اور خدا و رسول کا بھی حکم یہی ہے کہ جوان کو بٹھا نہ رکھو، شادی کر دو۔ وَرائے اِن باتوں کے، ایک شخص نے تمھارے واسطے گھر بار چھوڑا۔ سلطنت سے ہاتھ اُٹھا، کسی آفت سے منہ نہ موڑا۔ جی پر کھیل گیا، کیا کیا بلائیں جھیل گیا۔ سر کھپی اور جان جوکھوں کی؛ جب تم نے ہم کو دیکھا، ہم نے تمھاری صورت دیکھی۔ شکل میں پری شمائل، فرخندہ خو، فرشتہ خصائل۔ تمام شہر عاشقِ زار ہے۔ چھوٹا بڑا اُس پر فریفتہ و نثار ہے۔ ہر چند، تم پارۂ جگر، نورِ نظر ہو یا مگر واری، جو انصاف ہاتھ سے نہ دو تو تم میں اُس میں بڑا فرق ہے! تمھیں اللہ نے عورت بنایا ہے، وہ مردِ میدانِ نبرد ہے۔"(47)

یہاں عبارت کی رنگینی لاشعوری طور پر سادگی اور سلاست میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔ زبان بھی اپنے فطری مزاج کی طرف جاتی نظر آتی ہے۔ اور ہمارے سامنے اردو نثر کا وہ اُسلوب آتا ہے فضلی کی "کربل کتھا" سے ہوتا ہوا، شاہ عالم کی "عجائب القصص" اور پھر تحسین کی "نوطرزِ مرصّع" کے بعد "فسانۂ عجائب" میں ارتقا کی طرف گامزن ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین "فسانۂ عجائب کے اُسلوبِ بیان کے حوالے سے بجا لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ "فسانۂ عجائب" کا اسلوب غیر فطری ہے۔ پڑھنے میں قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں۔ منظر کشی اور جذبات نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مطلب الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ جاتا ہے لیکن یہ بھی ایک طرز تھا جو گئے گزرے زمانے کی یادگار ہے، وہ زمانہ جب کہ ہر اردو پڑھا لکھا عربی فارسی میں کچھ شدبد رکھتا تھا۔ ترصع اور رنگینی ہی کو علم کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ سرور کے خیالات بوجھل زربفتی پوشاک میں ملبوس ہیں۔ اس کی قدردانی کے لیے عارضی طور پر قدیم ذہنیت پیدا کیجیے۔ ہر جملے کے فقروں کو رک رک کر صحیح عطف و اضافت کے ساتھ پڑھیے اس وقت اس کا لطف آئے گا۔"(48)

بحیثیت مجموعی فسانۂ عجائب کے اسلوبِ بیان کو دیکھا جائے تو بقول ڈاکٹر جمیل جالبی: یہ انوکھا اسلوب ہے اور اس انوکھی معاشرت و تہذیب کا ترجمان ہے، جو مغلیہ تہذیب کے ایک جزیرے میں، آصف الدولہ کے دور سے لے کر واجد علی شاہ تک، رونقوں کے ساتھ، پروان چڑھی تھی۔ اس اسلوب میں اس قصے کو پڑھتے ہوئے اکثر ایک راگ سا سنائی دیتا ہے جس کا اثر نشہ کا سا ہوتا ہے اور جب قاری اس میں محو ہوتا ہے اور قصے کی جاذبیت اسے اپنی طرف کھینچتی ہے تو یہ نشہ اس پر بھی طاری ہونے لگتا ہے اور اس وقت سرور کا اسلوبِ بیان ایسا اثر کرتا ہے کہ اسی طرح کی زبان اور فقرے قاری کے منھ سے بھی نکلنے لگتے ہیں۔ یہ رنگ لکھنو کے ماحول میں قدرتی رنگ تھا اور اس دور کے شرفا اسے نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ خود بھی اسی قسم کی عبارت بولتے تھے۔ سرور کا اسلوب ایک گزرے ہوئے دور کا نمائندہ ضرور ہے لیکن اس کا مخصوص اثر آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس تہذیب کی ترجمانی اسی اسلوب میں ہو سکتی تھی اور اسی لیے یہ اس تہذیب کا شاہ کار ہے اور اردو ادب کا "کلاسیک" ہے۔(49)

المختصر ایک خاص ماحول، معاشرے اور ضرورت کے تحت لکھی گئی لکھنوی تہذیب و ثقافت کی نمائندہ درج بالا دونوں داستانیں اردو کے قدیم نثری سرمائے میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں داستانوں کے مصنفین نے اپنے زمانے کے ادبی مذاق کے مطابق دونوں داستانوں کو اُردوے معلّٰی کے لباسِ حریری میں پیش کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے اور اس میں دونوں ہی اپنی اپنی جگہ کامیاب ہوئے ہیں۔ الغرض ان دونوں قصوں کے اُسلوبِ نگارش کے مطالعے سے اردو زبان کے اُس اُسلوب کی تصویری جھلکیاں ہمارے سامنے آجاتی ہیں جو فارسی انشاپردازی کے تتبع میں بہت عرصے تک پڑھنے والوں کے مزاج اور ذوق کی آبیاری کرتا رہا ہے۔ درحقیقت ان دونوں داستانوں کے اُسلوبِ نگارش کے مطالعے سے آج کا ادبی مذاق رکھنے والا طبقہ بھی اُسی طرح لطف اندوز ہوتا ہے جس طرح اُس دور کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ حظ اٹھاتا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کے ادبی مذاق رکھنے والے قاری کو اس طرف راغب کیا جائے تاکہ مرصّع و رنگین فارسی و عربی اُسلوب کا مرعوب کن انداز جو مغلوں کے عروج و اقبال کے زمانے میں شوکت و تجمل کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ اس روایت کو زندہ رکھا جا سکے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

حواشی

(1)ہاشمی،نورالحسن،(مرتب) ،نوطرزِمراصّع،از:میر محمد حسین عطاخان تحسین، بھارت،ہند ستانی اکیڈمی الہ آباد،1958ء،(مقدمہ)ص26،27

(2) تحسین،میر محمد حسین عطاخان،نوطرزِمراصّع،مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی،بھارت،ہند ستانی اکیڈمی الہ آباد، 1958ء،ص54

(3)جین،گیان چند،اردو کی نثری داستانیں،کراچی،انجمنِ ترقی اردو پاکستان،2014ء،ص202

(4) تحسین،میر محمد حسین عطاخان،نوطرزِمراصّع،مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی،بھارت،ہند ستانی اکیڈمی الہ آباد،1958ء،ص 77

(5) ایضاً،ص ۱۵۰

(6) ایضاً،ص ۲۰۸

(7) ایضاً،ص300

(8)ایضاً،ص83

(9)ایضاً،ص99

(10)ایضاً،ص105

(11) میرامن،باغ وبہار،مرتبہ،رشید حسن خاں،بھارت،ص25

(12)ایضاً،ص34

(13)ایضاً،ص39

(14) تحسین،میر محمد حسین عطاخان،نوطرزِمراصّع،مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی،بھارت،ہند ستانی اکیڈمی الہ آباد1958ء،ص71،72

(15)ایضاً،ص74،75

(16)ایضاً،ص123،124

(17) ایضاً،ص 245

(18) ایضاً،ص268، 269

(19)ایضاً،ص256

(20)ایضاً،ص 274،275

(21)جالبی،ڈاکٹر جمیل،تاریخِ ادبِ اردو،جلد دوم:حصہ دوم،لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب،طبع اول1982ء،ص1101

(22)جالبی،ڈاکٹر جمیل،تاریخِ ادبِ اردو،جلد سوم،لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب،طبع اول2006ء،ص607

(23)سرور،رجب علی بیگ،شگوفۂ محبت،لکھنو،تامی پریس،1893ء،ص4

(24)خان،رشید حسن،(مرتب)فسانۂ عجائب ازرجب علی بیگ سرور،نئی دہلی،انجمنِ ترقیِ اردو،1990ء،ص344

(25) سرور،رجب علی بیگ،فسانۂ عجائب،مرتبہ:رشید حسن خان،نئی دہلی،انجمنِ ترقیِ اردو،1990ء،ص26تا31

(26) خان،رشید حسن،(مرتب)فسانۂ عجائب ازرجب علی بیگ سرور،نئی دہلی،انجمنِ ترقیِ اردو،1990ء،ص37،38،39

(27) خان،رشید حسن،(مرتب)فسانۂ عجائب ازرجب علی بیگ سرور،نئی دہلی،انجمنِ ترقیِ اردو،1990ء،ص95

(28)جین،ڈاکٹر گیان چند،اردو کی نثری داستانیں،کراچی،انجمنِ ترقیِ اردو،2014ء،ص498

(29) سرور،رجب علی بیگ،فسانۂ عجائب،مرتبہ:رشید حسن خان،نئی دہلی،انجمنِ ترقیِ اردو،1990ء، ص28

(30) سرور،رجب علی بیگ،فسانۂ عجائب،مرتبہ:رشید حسن خان،نئی دہلی،انجمنِ ترقیِ اردو،1990ء،30

(31) ایضاً،ص31

(32) جین،ڈاکٹر گیان چند،اردو کی نثری داستانیں،کراچی،انجمنِ ترقیِ اردو،2014ء،ص510

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

(33) جالبی،ڈاکٹر جمیل،تاریخِ ادبِ اردو، جلد سوم،لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، طبع اول2006ء، ص635
(34) سرور،رجب علی بیگ، فسانۂ عجائب، مرتبہ: رشید حسن خان، نئی دہلی،انجمنِ ترقیِ اردو،1990ء، ص32،33
(35)ایضاً ص 52
(36)ایضاً ص 72،73
(37) ایضاً ص 105
(38) ایضاً ص264
(39) ایضاً ص302
(40)ایضاً ص53
(41) ایضاً ص57
(42)ایضاً87،88
(43) ایضاً ص325،326
(44) ایضاً ص102
(45) ایضاً ص114
(46) ایضاً ص208،209
(47) ایضاً ص131،132
(48) جین،ڈاکٹر گیان چند،اردو کی نثری داستانیں، کراچی،انجمنِ ترقیِ اردو،2014ء، ص517،518
(49)جالبی،ڈاکٹر جمیل،تاریخِ ادبِ اردو، جلد سوم،لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، طبع اول2006ء، ص639